باہر لاتا ہے.. وہ مچھلی کوئی اور ہوتی ہے.. تو نظارہ بھی کوئی اور ہوتا ہے' بدلتا ہے سائیں آنکھ جھپکنے سے بدلتا ہے.."

جعفر کی آبی منطق نے اسے چیزوں کو... انہی تغیرات' انہی موسموں اور انہی عناصر کو جنہیں ہزاروں بار دیکھا جا چکا ہوتا ہے ایک سراسر نئی اور اچنبھے میں ڈال دینے والی نگاہ سے روشناس کیا.. جیسے ندی کا پانی سدا وہی نہیں رہتا جس پر آپ نظریں جمائے اسے دیکھتے ہیں' بدلتا رہتا ہے.. وہ پانی جن پر آپ کی نگاہ ہے بہہ جاتے ہیں اور نئے پانی آجاتے ہیں.. اور منظر بدل جاتا ہے.. جیسے ہر محبت پہلی سی نہیں ہوتی' جیسے ہر نوزائیدہ بچے کے کھیلنے کا انداز مختلف ہوتا ہے... ایسے ہی سندھ سائیں کے پانیوں اور کناروں کے نظارے حیاتی بھر اپنے آپ کو نہیں دوہراتے.. صرف وہ پرندہ جواب مور کی جون میں تھا اپنے آپ کو دوہراتا بولتا تھا..

"ماماں... ادھر جو سامنے کناروں پر بیلا گزرتا ہے.. سرکنڈوں اور کائی کے زرد اور نیم ہریاول کے گھنے بوٹوں کا.. تو اس میں سے کچھ بولتا ہے.. تم سنتے ہو؟"

"ادھر کیا بولے گا سائیں.. کچھ بولے گا تو پانی میں سے بولے گا.. ادھر تو سنسان ہے۔"

"پانی میں سے کیا بول سکتا ہے؟"

"باغوں بلا سائیں.."

"کیا؟"

"پانی کی بلا ہوتی ہے سائیں.. وہ کبھی کبھی حیاتی میں دو چار بار ہی بولتی سنائی دیتی ہے.. وہ بولے تو ہم کشتی کو پھیر کر واپس چلے جاتے ہیں.... جو سندھ سائیں کے سفر سے واپس نہیں لوٹتے ہم جان جاتے ہیں کہ باغوں بلا کے بولنے پر بھی وہ مچھلی اور مرغابی کے چاؤ میں اندھے ہو کر کشتی کو کھیتے رہے اور پھر بلا نے انہیں نگل لیا..."

"تو تم نے کچھ نہیں سنا... کسی پرندے کو... کسی.. مور کو؟"

"مور کو؟... وہ نمانا ادھر پانیوں کے آس پاس کہاں سے آئے گا سائیں.. اُدھر چولستان میں جھنکار تا پھرتا ہے... میں نے تو آج تک اس کا نظارہ بھی نہیں کیا۔"

شاید وہ صرف اس کے تن بدن میں کوکتا تھا.. اسے اور کوئی نہیں سن سکتا تھا..

سرور کشتی کے پچھلے حصے میں منہ کھولے سو رہا تھا اور دریائی مکھیاں اس کے سیاہ چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں.. پکھی اس کے نیند میں ٹھہرے ہوئے جثے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کی لشکتی آنکھوں میں کسی ایسی پیاس کے قصے تھے جس نے ہزاروں برس پہلے اس کے دراوڑ بدن کو خشک کر دیا تھا لیکن اس نے وہ مٹھی نہیں کھولی تھی جس میں کنک کے چند دانے تھے..

صرف فہیم کشتی پر نہ تھا..

اس نے آج سویرے جب کہ اس کی آنکھوں میں ابھی تک انڈس کوئین تیرتی تھی.. تاریکی میں غیر مرئی ریلنگ کے سہارے کھڑی وہ پاگل خانہ اپنی غلافی آنکھیں جھپکاتی تھی فہیم نے آج سویرے اس کے لیے دیسی انڈے فرائی کیے تھے' ڈیرے کی کسی نیم پخت بیکری کی ڈبل روٹی کے سلائس توے پر سینکے تھے اور کسی نا آسودہ بھینس کے مکھن کو ان پر لگا کر اسے ایک صاحبوں ایسا ناشتہ مہیا کیا تھا اور پھر پوچھا تھا "سائیں رات کے کھانے میں کیا لو گے؟"

"کچھ بھی.." اس نے کہا تھا "دال چاول.. روٹی... اچار کے ساتھ.. کچھ بھی"

"نہ سائیں.." فہیم آزردہ سا ہو گیا "یہ سب کچھ تو بے عقل مہانے بھی کھلا سکتے تھے.. میں جو اپنے ہیڈ ماسٹر کو ناراض کر کے آیا ہوں تو اس لیے تو نہیں آیا ہوں کہ آپ دال چاول اور روٹی کھائیں.." یہ اس کی انا کا مسئلہ بھجائی دیتا تھا "نہ سائیں... میں تو آپ کے لیے آج رات مرغی بھونوں گا اگر اللہ چاہے.. اور مرغی میں ابھی لاتا ہوں.."

"کدھر سے؟"

"سندھ ساگر کے کنارے ادھر سے تو بے آباد لگتے ہیں لیکن آباد تو ہیں ناں سائیں.. تو کسی گاؤں میں جاتا ہوں اور آپ کے لیے مرغی لاتا ہوں۔"

اس سے پیشتر کہ وہ اسے بتاتا کہ وہ مرغی کا اتنا شوقین نہیں ہے' فہیم نے اپنے آپ کو کپڑوں کی قید سے آزاد کیا انہیں سمیٹ کر سر پر رکھا اور پھر اپنی محبوب ٹیوب کو آغوش میں لے کر سندھ میں کود گیا..

چنانچہ فہیم کشتی پر نہیں تھا..

جب سے وہ غازی گھاٹ سے چلے تھے.. کشتی نے کنارے کو چھوڑا تھا.. وہ سندھ ساگر میں تنہا مسافر تھے.. اس کے پانیوں پر اکیلے پکھیرو تھے جو تیرتے تھے... وہ اپنی تنہائی کے

اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ انہیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے سوا اس دریا کی ملکیت کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے..

انہیں ایک دھچکا سا لگا جب انہوں نے پہلی بار کسی اور کو دیکھا..

دو بادبانی کشتیاں دکھائی دیں..

وہ اُن سے بہت فاصلے پر تھیں' ایک ویران پٹی کے دوسری جانب دریا کی تیز بہاؤ والی شاخ جو چوڑے اور دھوپ میں چمکتے پاٹ کی تھی اس میں وہ مختصر سائز کی بچوں کی سی جو ہر میں تیرتی کھلونا کشتیوں کی مانند تیرتی جاتی تھیں اور ان کی رفتار ایسی تھی کہ دھوپ سے روشن پانیوں پر تیزی سے پھسلتی ہوئی لگ رہی تھیں... ان کا رخ غازی گھاٹ کی جانب تھا.. ان میں سے ایک جس کا بادبان سفید رنگ کا تھا وہ ایک بے چین پتنگ کی طرح ہوا سے پھولتی ہوئی پانی سے اٹھنے کو لگتی تھی اور دوسری سیاہ بادبان والی تھی.. ایک چپگادڑ نظر آتی تھی جو سطح آب پر تیرتی چلی جا رہی تھی..

"یہ بھی تمہارے قبیلے کی کشتیاں ہیں؟"

"نہیں سائیں.." جعفر نے ذرا آگے ہو کر سندھ میں تھوکا" یہ تو کمینے لوگ ہیں.. کاروباری لوگ ہیں.. یہ تو دریا میں نکلتے ہیں تو مچھلی اور پرندوں کی بربادی کر دیتے ہیں.. پکڑ کر شہر لے جاتے ہیں اور پیسہ بناتے ہیں... رہتے کہیں اور ہیں زمین کے باسی ہیں اور سندھ میں صرف لالچ لے کر اترتے ہیں.. ہماری طرح پانی کا پونگ نہیں ہیں' یہ تو پانی کو بیچ کھانے والے ہیں.. بے اعتبارے ہیں۔"

"رزق کے لیے تو سب لوگ کوشش کرتے ہیں ماماں.."

"نہ سائیں.. اپنے پیٹ کے لیے کریں تو جائز ہے.. پر یہ دوسروں کے پیٹ کے لیے سندھ کو اجاڑتے ہیں.. اللہ سائیں نے سندھ سائیں کے اندر اتنا رزق پیدا کیا ہے کہ روز قیامت تک اس میں کمی نہ آئے.. ہم اور پرند پکھیرو اور مچھلی برابر کی زندگیاں کرتے ہیں... پر یہ باہر والے جو ہیں یہ ان کا گھر نہیں ہے اس لیے ان کو کیا پروا کہ یہ بے شک اجڑ جائے.. مچھلی کم ہو گئی ہے.. سرور نہیں بیٹھا رہا کل اور سب کچھ بیکار گیا.. ان کی وجہ سے پرند پکھیرو بھی ہم سے بے اعتبارے ہو گئے ہیں.. میں نڈھا تھا ناں سائیں' چھوٹا بچہ تھا تو اپنے باوا کے ساتھ سندھ میں نکلتا تھا.. ہماری کشتی جب کسی ایسے ٹاپو کے پاس سے گزرتی تھی ناں

جس پر کونجوں اور سرخابوں کا بسیرا ہوتا تھا تو وہ بس ایک بار چونچیں اٹھا کر ہمیں دیکھتے تھے اور پھر اپنے دانہ پانی اور گھاس چگنے لگتے تھے' بیٹھے رہتے تھے.. پر اب تو ایسا ہو گیا ہے سائیں کہ وہ بے اعتبارے ہو گئے ہیں.... کشتی کو دور سے دیکھ لیں تو شور مچاتے اڑ جاتے ہیں.. مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے باوا کے ساتھ ایک ٹاپو پر اترا تھا اور ہم دونوں دم روکے پرندوں کے درمیان میں چلتے گئے تھے اور مجال ہے کہ ان میں سے ایک بھی پھڑ پھڑا کر اڑا ہو.."

دونوں کشتیاں.. سفید اور سیاہ بادبان پھڑ پھڑاتی لمحوں میں اوجھل ہو گئیں اور کرنوں سے دمکتی چادر پھر سے خالی ہو گئی۔

"تم لوگ سدا سے سندھ میں ہی رہتے ہو؟"

"ہاں سائیں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سندھ سائیں کے ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے.. اس کی پہلی بوند کے ساتھ.. پر کبھی ایسا ہو جاتا ہے شادی بیاہ کے موقع پر کہ ہم یہ بوٹی بہت پی لیتے ہیں تو ہمارا ایک بڑا ہے مہانوں کا... اس کو سب مامن ماسا بولتے ہیں.. پتلا چھمک ہے' بہت وڈیرا ہے پر ابھی تک جھکا نہیں ہے.. وہ کبھی خشکی پر نہیں اترا سائیں' ہمیشہ کشتی میں رہتا ہے.. تو جب وہ خشخاش اور کالی مرچ والی خاص بوٹی پیتا ہے جو منہ اندھیرے سے جب سویرے کا تارا ابھی آسمان پر کھڑا ہوتا ہے گھوٹی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہم سدا سے سندھ کے باسی نہیں ہیں... اوپر ادھر چولستان کی ریتوں میں کسی زمانے میں کوئی سرسوتی نام کا دریا تھا جس کے کناروں پر ہماری بستیاں تھیں.. بوٹی زیادہ پی لیتا ہے ناں مامن ماسا تو ایسی باتیں کرتا ہے.. اور پھر وہ کہتا ہے کہ وہ دریا اللہ سائیں کی مرضی سے سوکھ گیا تو ہم لوگ ادھر آ گئے.. وہ کہتا ہے۔"

"اگر سندھ سوکھ گیا تو پھر کہاں جاؤ گے؟"

"نہ سائیں یہ تو ہمارا پالن ہار ہے.. ان داتا ہے اور سائیں ہے یہ کیسے سوکھ سکتا ہے.. یہ بھی اگر اللہ سائیں کی مرضی سے سوکھ گیا تو پھر ہم بھی سوکھ جائیں گے۔"

برمانی کے آشرم میں' اس کے کنج کے اندر' جہاں ایک چوبیارہتی تھی' ایک سانپ کا بسیرا تھا وہاں کتابوں کے شیلف کے نچلے حصے میں ٹھیکریوں' منکے موتیوں' پرانے سکوں اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کی ایک بستی بے اعتنائی اور بے خبری کی دھول سے اٹی پڑی تھی.. کل سویرے جب تالاب کے گرد بلند ہوتے سرکنڈوں پر ابھی اوس چمکتی تھی اور اس کی

بوندیں پانی میں ٹپ ٹپ کرتی گرتی تھیں اور انہی سرکنڈوں کے اندر چڑیوں کا شور بے حساب اور کانوں میں کھلکھلاتا تھا اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے جب سرکنڈے اس کے بدن کو چھوتے تھے اور ہلتے تھے تو اوس کی بوندیں زیادہ تیزی سے تالاب میں گرتی تھیں اور سرکنڈوں کی دھاریں تیز تھیں اور اس کے یخ بستہ ہاتھوں پر خراشیں چھوڑتی تھیں..

وہ کمرے میں واپس آیا تو اس نے شیلف میں ڈھیر ٹھیکریوں اور منکے موتیوں میں اوندھی پڑی مٹی کی کہ اُس مورت کو دیکھا جس پر اس کی نظر نہیں گئی تھی... مٹی کی اس مورتی پر صدیوں یا شاید ہزاروں برسوں کی راکھ اور اس میں سے نمودار ہوتی چونے کی سفیدی تھی جو اس کے نقش و نگار پر جمی ہوئی تھی.. بڑی بڑی نشیلی اور ترچھی آنکھیں جو مہر گڑھ کے کھنڈروں سے ملنے والی مورتیوں ایسی تھیں 'ستواں مگر قدرے چوڑی ناک' بال نہایت جدید انداز میں گندھے ہوئے اور شانوں تک آئے ہوئے... اس کی ایک چھاتی قائم تھی اور دوسری اکھڑ چکی تھی... وہ موہنجوڈارو کے کنگ پریسٹ کے قبیلے کی لگتی تھی.. اس کی آنکھیں بے حد زندہ لگتی تھیں.. انہیں بہت دیر تک دیکھنے سے گھبراہٹ سی ہوتی تھی.. وہ بالشت بھر بھی نہ تھی لیکن دیکھنے والے کو اپنے اثر میں لے لیتی تھی.. اسے جس کسی نے بھی بنایا تھا.. مٹی گوندھ کر اسے شکل دی تھی اور پھر آگ میں پکایا تھا بے دھیانی میں نہیں بنایا تھا.. خیال سے اس کے نقش اور چھاتیاں نہیں ابھاریں تھیں' اس کے سامنے وہ تھی ایک ماڈل کے طور پر.. اس نے اسے جیتنے کے لیے اسے بنایا یا وہ اس کے بس میں نہ آتی تھی تو اسے پوجنے کے لیے اسے شکل دی.. بہر طور یہ مورتی کبھی زندہ تھی۔

پکھی نے اپنا جھگا اٹھایا اور اپنے بچے کے سر کو چھاتی سے لگالیا..

وہ دونوں ہو بہو تھیں.. مورتی اور پکھی!

اگرچہ اس کی دونوں چھاتیاں سلامت اور زندہ تھیں.. اور اس نے ان میں سے ایک دھڑکتی اور مدھر چھاتی کو بچے کے منہ میں دیا اور پھر جھگا نیچے کیے بغیر ماماں جعفر سے باتیں کرتے.. سیاہ اور سفید بادبانوں والی کشتیوں اور مامن ماسا اور سرسوتی کی باتیں کرتے اپنا جھگا نیچے کیے بغیر خاور کی جانب آنکھ بھر کر دیکھا.. نشیلی اور ترچھی آنکھیں جو زندہ تھیں اور انہیں بہت دیر تک دیکھنے سے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی.. خاور نے نظریں جھکالیں.. وہ جھجک گیا.. اس نے منہ پھیر کر ماماں جعفر کی طرف دیکھا جو ایک مرتبہ پھر کیپٹن اہاب کے

انداز اپنا چکا تھا اور سندھ ساگر کو اپنی نظروں سے چھان رہا تھا..

جیسے منہ موڑنے کے باوجود وہ مورتی اس کی پشت سے آلگی ہو..اس کی ایک چھاتی اس کے ماس کو چھوتی ہو اور دوسری کا خلا اسے بے چین کرتا ہو کہ کسی طرح وہ بھی بھر جائے اور اس کے ساتھ آن لگے..اس کا اپائے تو صرف پکھی کے پاس تھا کہ وہ سلامت تھی..وہ عمر کے اس ادھیڑ بن تک پہنچتے ہوئے ترغیب اور کشش سے تقریباً بیگانہ رہا تھا..جان بوجھ کر اپنے آپ پر قابو رکھ کر نہیں بلکہ اس کے اندر یہ حس شروع سے ہی کم تھی..جن دنوں میں ہر شے نئی نویلی اور چمکیلی اور ناتجربہ کار تھی اور اس کے دوست کسی ایک ٹخنے کی جھلک دیکھ کر بھڑک جاتے تھے وہ بے اثر اور ٹھنڈا رہتا تھا اور اسے حیرت ہوتی تھی کہ نسوانی وجود میں وہ کیا ہے جو انہیں یکدم بے حال کر دیتا ہے..ان وقتوں میں اس کے بس سے باہر جو بدنی مجبوریاں تھیں ان کی بھڑک شادی کے دو تین برسوں میں ہی بجھ گئی اور وہ ان سلسلوں سے تقریباً بے نیاز ہو گیا..اور اب تو پت جھڑ کی نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں..اور اس کے باوجود یہ جو مکمل مورتی تھی جان بوجھ کر اپنا جھگا اٹھائے اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہوئی وہ اس کے اندر چھید ڈالتی تھی..

اس نے اسے پہلے بھی کہیں تو دیکھا تھا..

مورتی کی صورت میں نہیں..کہیں اور..پر کہاں..شاید یہ ان پانیوں کے علم میں تھا جو اس کشتی کو سہارتے اسے آگے لے جاتے تھے..

وہ ایک اور ریتلے ٹاپو سے کھیتے ہوئے گزرے...ریت لشکتی اور ویران تھی..

جعفر نے پانیوں کو چھانتی نظروں کو الگ کیا اور مڑ کر کہنے لگا "سائیں آپ کے آنے میں دیری ہو گئی ہے..کونجیں وداع ہو گئی ہیں..یہ ٹاپو ان سے بھرا رہتا تھا..آپ ریت کو تو دیکھو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھرا ہوا تھا۔"

ٹاپو بہت نزدیک تھا..کشتی اس کے کناروں سے چھوتی اٹکتی آگے ہوتی تھی اور شفاف دھوپ میں دکھائی دیتا تھا کہ وہاں جو ریت ہے ان چھوئی نہیں ہے..اس پر پنچھوں کے نشان ثبت ہیں..جیسے اجرک کے کپڑے پر جا بجا چھاپے لگے ہوں..کونجوں کے بھار سے وہ نشان اتنے گہرے تھے کہ ہوا انہیں پوری طرح بھر نہیں سکی تھی اور ریت کے سپاٹ چہرے پر دھوپ انہیں نمایاں کرتی تھی...

"کونجیں وداع ہو گئی ہیں سائیں.." جعفر کی آواز میں ہر ایک کونج کا جو اس پر اتری تھی دُکھ تھا "ادھر سے اڑ کر وہ کونج دشت کو جاتی ہیں اور پھر واپس ہو جاتی ہیں جدھر ان کے گھر اور گھونسلے ہوتے ہیں۔"

"کدھر؟"

"اپنے وطنوں کو لوٹتی ہیں سائیں.. ادھر تو مہمان ہوتی ہیں.. پر جب آتی ہیں تو کونج دشت کو ایسے بھرتی ہیں کہ زمین دکھائی نہیں دیتی.. لگتا ہے پوری کائنات میں صرف کونجیں ہیں جو کرلاتی ہیں اور کلبلاتی ہیں.. ان کی چونچیں اور پر ہیں اور ان کے پنجے ہیں اور ان کا ہجوم زمین پر بچھنے کے لیے آیا ہے.."

کونج دشت تو ویران تھا.. وہاں کوہ سلیمان کے دامن تک ایک بھی کُونج نہ تھی..

کُونج دشت.. دلورائے کے گمنام اور پر شکوہ کھنڈر.. جہاں سے برمانی کو شدید بارشوں کے بعد ٹھیکریوں میں سے ظاہر ہوتی صرف ایک چھاتی والی جدید ہیئر ڈو والی پتلی لمبی آنکھوں والی مورتی ملی تھی.. جام پور... اور ہڑپہ کی گندم پیسنے والی چکیوں کے زمانے کی بستی داجل سے پرے.... برمانی اسے کوہ سلمان کے دامن تک ہڑند قلعہ کے باقیات دکھانے کے لیے لے گیا تھا..

سورج کا سنہری رتھ کوہ سلمان کے عقب میں اتر چکا تھا..

ڈھلتی شام میں اس سلسلہ کوہ میں کاہا درّے کی دراڑ چٹانوں کے اندر تک جاتی تھی.. اور وہاں سے بلوچستان تک جا نکلتی تھی... اسی نام کی.. کاہا رود کی بھی اپنے پانی کو سنبھالتی یہاں سے ظاہر ہوتی تھی۔ اسی درے کے قریب... آس پاس دور دور تک صرف خشک اور بے آباد چٹانیں تھیں لیکن اس درّے کے دروازے میں کھجوروں کے جھنڈ تھے جہاں مدتوں پہلے قافلے ٹھہرتے تھے..

ہڑند کے شکستہ داخلے کے باہر ایک مکان میں ایک لالٹین روشن تھی۔

دروازے کے اندر داخل ہونے پر نہ کوئی شیش محل تھے اور نہ کوئی دیوان خاص. شام کی اترتی سیاہی میں تاحد نظر ٹیلے ٹھیکریاں اور ایسے کھنڈر تھے جن کی تاریخ کی کڑیاں ابھی تک نہیں جڑ سکیں.. مقامی روایتیں تھیں' سکندر اعظم کے کسی ثبوت کے بغیر قصے تھے... ہڑند کا شہر.. موہنجوڈارو کا بھائی تھا یا اس سے بھی قدیم کوئی بستی تھا یہ کوئی نہیں جانتا۔

اسے ہڑند کی کڑیاں گم ہو جانے کا قلق نہ تھا..

لیکن اس کے راستے میں پڑتے کونج دشت کی ویرانی نے اسے بے گھر اور بے آسرا کر دیا..

کچی اور حالیہ بارشوں کی زد میں آکر کیچڑ بھری سڑک.. جس پر شام کے خوف میں ان کی دھواں دیتی بار بار رکتی اور دل کو روکتی کہ اگر یہاں رات ہو گئی تو کیا ہو گیا.. وہ جیپ ایک ویران جہان میں ہچکولے کھاتی جاتی تھی جب برمائی نے دائیں جانب اشارہ کر کے کہا "سائیں یہی کونج دشت ہے.."

جیپ سے پرے کائنات کے آخر تک اور شاید اس سے بھی پرے ایک ویرانہ جاتا تھا.. اور اس سے بھی پرے تصور اور خیال کی حدوں سے آگے وہ دشت وہ ویرانہ جاتا تھا جو کوئی موسم یا زمانے ایسے تھے جن میں یہ کونجوں سے بھر جاتا تھا..

اور جب ہڑند کی مسافت کے راستے میں یہ دشت آیا تو ویران نظر آیا اور وہاں ایک بھی کونج نہ تھی..

یہ سرسوتی کی مانند خشک ہو چکا تھا..

لیکن سرسوتی کی پاروشنی اب سندھ کے کناروں پر آکر بس چکی تھی اور اب اپنا جھگا نیچے نہیں کرتی تھی تاکہ وہ دیکھ لے کہ وہ ابھی تک سالم ہے.. ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اس کی ایک چھاتی دلورائے کے کھنڈروں میں سے ظاہر ہونے والی مورتی کی مانند اکھڑی نہیں قائم ہے اور اس بچے کو دودھ پلاتی ہے جو سرسوتی کی خشک ریت پر پیاس سے سکڑتے بدنوں کے ملاپ کا ثمر تھا..

سومرو کے بیج سے پھوٹا تھا..

سرسوتی خشک ہو چکا تھا..

راوی خشک ہو رہا تھا..

.... اور سندھ نے ابھی خشک ہونا تھا..

دولہا دولہن اپنے کمرے میں جا چکے تھے..

سائیڈ ٹیبل کا لیمپ ابھی تک روشن تھا.. دیواروں پر تازہ پینٹ تھا اور وہ شیڈ میں سے نکلنے والی ہلکی روشنی کو گیلاہٹ کی وجہ سے جذب نہیں کرتا تھا بلکہ اسے دوچند کر کے کمرے کی ہر شے کو نمایاں کرتا تھا..

"لیمپ آف کر دو بھئی..." مرزا صاحب ناگواری اور تھکن میں بڑبڑائے' آنکھیں کھولیں جو تھکاوٹ میں بوجھل اور پژمردہ تھیں اور ان کے چہرے کی نسبت کہیں زیادہ بوڑھی اور بے جان لگتی تھیں' کروٹ بدل کر اپنے برابر میں چھت کو گھورتی غلافی آنکھوں پر ایک غصیلی اور شکایت آمیز نظر ڈالی "سو جاؤ... صبح ولیمے کی تیاری کرنی ہے۔"

اس کی نیم سنہری غلافی آنکھیں کھلی تھیں اور چھت کے اس حصے کو دیکھے جا رہی تھیں جس پر پینٹ کا فائنل کوٹ ہونے سے رہ گیا تھا.. اور وہاں ہلکے گلابی رنگ کا ایک پیچ باقی تھا جو چھت کے بقیہ حصے سے بالکل الگ نظر آ رہا تھا.. دن کی روشنی میں وہ نامعلوم رہا تھا اور اسے نظر نہیں آیا تھا ورنہ وہ پینٹ کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی.. اب یوں چت لیٹے ہوئے لیمپ شیڈ کی بالائی گولائی میں سے ایک خاص زاویے پر نکلنے والی براہ راست روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور اسے الجھن ہو رہی تھی.. اگرچہ ایمرجنسی میں پورے گھر کو رینوویٹ اور پینٹ کرنے کے دوران اس قسم کی چھوٹی موٹی خامیاں تو رہ ہی جاتی ہیں لیکن پھر بھی اسے الجھن ہو رہی تھی اور وہ اس پیچ پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتی تھی اسے گھورے چلی جاتی تھی... کیا فرید کے کمرے کی چھت کا بھی کوئی حصہ اسی طور دوبارہ پینٹ ہونے سے رہ گیا تھا.. اگر ایسا ہوا تھا تو فرید تو اسے نہیں دیکھتا ہو گا اس کی دولہن دیکھتی ہو گی کیونکہ شادی کی پہلی

رات تو دولہن کے نصیب میں ان لمحوں میں صرف چھت کو دیکھنا ہی ہوتا ہے جو بے چارگی اور خیالی تمناؤں کی ناآسودگی کے آنسوؤں میں دھندلی نظر آتی ہے..

وہ اس لمحے کیا کر رہے ہوں گے ؟.. اس کا دل یکدم حسد اور جلن کی مٹھی میں بھینچا جانے لگا اور اس نے منہ کھول کر ایک لمبا سانس لیا.. وہ اپنی پہلی رات کا اس رات سے موازنہ کرنے لگی اور اس کا ذہن سلگنے لگا.. شٹ اپ یُو بچ.. شٹ اپ.. اس نے اپنے آپ کو ڈانٹا.. آر یو جیلس ؟ یس آئی ایم... بچ نے غراتے ہوئے کہا.. ہاں میں ہوں.. بیٹے محبوب ہوتے ہیں اور وہ ایک ہی شب میں تمہاری عمر بھر کی مامتا اور محبت فراموش کر دیتے ہیں.. صرف ایک اجنبی بچ کی خاطر...

شٹ اپ.. اس نے پھر اپنے آپ کو سرزنش کی اور اپنے آپ کو پر سکون کرنے کے لیے اور اپنی کمینگی سے توجہ ہٹانے کے لیے زیر لب وہ تسبیح دوہرانے لگی جو زندگی بھر دوسروں کے خاوندوں کو تاکنے اور انہیں زیر کرنے والی مسز آفریدی نے توبہ تائب ہو کر اپنے گھر میں درس کا آغاز کرنے کے بعد اسے بتائی تھی.. لیکن اس کا دھیان بار بار فرید کے کمرے کی چھت کی جانب جاتا تھا اور اس پر نظریں جمائے دولہن کی جانب جاتا تھا..

لیمپ کے نیچے تپائی پر کارک کے بنے ہوئے میٹ پر پانی کا گلاس دھرا تھا..

بہت دنوں بعد آج شادی کے ہنگامے میں جب کہ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے کہتے اس کی باچھیں پتھرا چکی تھی' ٹانگوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' بھاری بروکیڈ کے لباس کے بوجھ سے اس کے کندھے دکھنے کو آئے تھے اور کمر کے گرد جہاں اس نے لہنگے کو کسا تھا ابھی تک ازار بند کی گرفت ماس میں گھبی ہوئی تھی' اس نے اپنی گولیوں اور کیپسول کو فراموش کر دیا تھا... وہ اس کے ذہن میں تو تھیں لیکن موقع ہی نہیں ملا تھا.. اگر ایک دن کا ناغہ ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے.. اگرچہ جو آنے کو ہے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا.. اس نے چھت سے نظریں ہٹائیں اور دونوں کہنیاں فوم میں ٹکا کر اٹھی اور کمبل پرے کر کے بیٹھ گئی مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ خراٹے لیتے مرزا صاحب ڈبل بلینکٹ کے ذرا سے کھسکنے کو محسوس نہ کریں..

اس کا ہینڈ بیگ تپائی کے نچلے حصے میں تھا.. وہ جھکی اور آہستہ سے اس کے سٹریپ پر انگلیاں جما کر اسے اٹھا لیا.. بیگ میں درجنوں لفافے ٹھنسے ہوئے تھے جن میں فرید کی

سلامیاں تھیں... ہر لفافے پر جلی حروف میں کسی رشتے دار کسی دوست کسی سہیلی کا نام تھا اور اس کے اندر کرنسی نوٹ کے ساتھ بھی یقیناً ان کا کارڈ سٹیپل کیا ہوا تھا تاکہ یہ پوری طرح عیاں ہو جائے کہ یہ قرض کس نے اتارا ہے یا کون ہے جس نے آیندہ کے لیے اپنے بیٹے یا بیٹی کے لیے یہ رقم انوسٹ کی ہے.. اس نے ان لفافوں میں سے بڑی مشکل سے دوائیوں کے پتے اور بوتلیں تلاش کیں' پھر خوراک کے مطابق انہیں نکال کر اپنی ہتھیلی پر سجایا اور ایک گہرا سانس لے کر انہیں پھانکا اور گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گال پھلا دینے والا بڑا گھونٹ بھرا.. اگرچہ گولیاں اور کیپسول حلق میں سے اتر گئے لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی وہیں اٹکے ہوئے ہیں اور اس نے متعدد گھونٹ لے کر گلاس کو خالی کر دیا..

مرزا صاحب کا منہ کھلا ہوا تھا اور اگر ان کی ناک میں سے ایک خرخراہٹ تھراتی ہوئی باہر آتی سنائی نہ دیتی اور ان کی ناک کے متعدد بال بار بار اٹھتے نظر نہ آتے تو وہ مردہ لگتے.. نیند ہر شخص کو بدصورت بنا دیتی ہے..

فون نمبر اس نے کئی ہفتے پہلے ہی حاصل کر لیا تھا... اس روز جب وہ فرید کی شادی کی تاریخ مقرر کر کے گھر آئی تھی.. اسی روز.. اور اسے زبانی یاد تھا.. اتنی بار ذہن میں دوہرا چکی تھی کہ اگر صرف سوچ سے ٹیلی فون کے نمبر دبتے جاتے تو اس کے گھر میں ٹیلی فون کی گھنٹی دن رات متواتر بجتی چلی جاتی..

وہ اپنی خوراک نگلنے کے بعد لیٹی نہیں' بیٹھی رہی' لیمپ کی روشنی میں اس کی نیم سنہری' غلافی اور کشش میں بہتی ہوئی.. سیال اور پل بھر میں متغیر ہونے والی جاندار آنکھیں... پورے کمرے پر راج کرتی تھیں... ان کی زد میں آنے والی ہر شے... ٹیبل لیمپ' گلاس بک شیلف' بچوں کی فریم شدہ تصویریں' کرسٹل کے زیبائشی گھوڑے اور بادبانی کشتیاں اور جاپانی کمبل.. ہر شے سیال حالت میں بہنے لگتی تھی.. لیکن بچوں کو جنم دینے سے اور مرزا صاحب کی مجنونانہ جنسی زبردستیوں سے اس کا بدن بہت بگڑا تھا' ڈھیلا اور بدوضع ہوا تھا لیکن اس کی آنکھیں اس توڑ پھوڑ میں سلامت رہی تھیں.. ان پر وقت کا بہاؤ اور بے چاہت دباؤ اثرانداز نہیں ہو سکے تھے..

صرف اس کے پاؤں کمبل میں روپوش تھے.. انہیں سمیٹ کر وہ پلنگ سے اتری اور بیڈروم سلیپرز کے بغیر ننگے پاؤں کمرے سے باہر آ گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر فرید کے بیڈروم کے دروازے کے نچلے حصے پر گئی اور وہاں فرش کے چپس کو نمایاں کرتی ہلکی سی روشنی ابھی تک تھی..

وہ دونوں کیا کر رہے ہیں... اس کے حسد نے پھر دوہائی دی اور پھر اس نے زیر لب بڑبڑا کر.. شٹ اپ یو بچ کہا اور لاؤنج میں آ گئی..

لاؤنج میں اندھیرا تھا.. اور اس میں گوٹی کناری کے لہنگے اور غرارے تھے.. سلک کی قمیصیں اور زیور تھے اور ڈائمنڈ نیکلس اور بندے تھے جو تاریکی میں بھی کہیں کہیں چمکتے تھے اور جنہیں نیند میں اترنے سے پیشتر اتارنے اور سنبھالنے کی زحمت کسی نے گوارہ نہ کی تھی.. تھکے ہوئے بے سدھ لوگ صوفوں پر... قالین پر... کمبلوں.. گرم چادروں اور رضائیوں میں لپٹے گہری خوابیدگی کے عالم میں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رکھتے تھے... البتہ قالین کا ایک حصہ خالی تھا کیونکہ وہاں دولہن نے پانی سے بھرا ہوا مٹکا توڑا تھا... مٹکے کی ٹھیکریاں بھیگے ہوئے قالین پر بکھری ہوئی تھیں... دولہا دولہن پر وارے گئے سفید چاولوں کے دانے تاریکی میں بھی فرش پر سفید اور بے حس و حرکت چیونٹیوں کی مانند دکھائی پڑتے تھے.. وہ پلیٹ ابھی تک ایک تپائی پر دھری تھی اور اس کی سطح سے وہ شیرینی چمٹی ہوئی تھی جس میں سے ایک چمچہ کھیر کا دولہن نے اپنے منہ میں ڈالا تھا... جہیز کا سامان' مہمانوں کے جوتے' مسلے ہوئے پھولوں کے ہار' گلدستے' بچوں کے کھلونے اور سالن کے ڈونگے... اسے بار بار ٹھوکر لگتی اور وہ اندھیرے میں ہاتھ پھیلا کر سنبھلتی' رک کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرتی اور پھر اگلا قدم اٹھاتی..

فرنچ ونڈوز کے قریب' لاؤنج کے آخر میں' ایک کونے میں' ٹیلی فون ڈائریکٹریوں کی دبیز جلدوں کے اوپر سرخ رنگ کا ٹیلی فون پڑا تھا.. اس کی گھنٹی کی آواز بند کر دی گئی تھی تاکہ مہمانوں کی نیند میں خلل نہ پڑے.. اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے گرفت میں لیا' دوسرے ہاتھ سے اس کی کیبل کھینچ کر سمیٹی اور پھر اسے اٹھا کر لاؤنج کا دروازہ کھولا اور باہر برآمدے میں آ گئی.. وہ بے اختیار کپکپائی اور مشکل سے اپنے دانتوں کو کٹکٹانے سے بچایا.. نومبر کی رات میں جو سرد اور نوکیلی دھار تھی وہ اس کے تھکاوٹ بھرے بدن تک اس کے شب خوابی کے ہلکے لباس کو چیرتی پہنچی اور اس کے ڈھیلے ماس کو تناؤ میں لے آئی.. گھر کے اندرون میں انسانی جسموں کی گرمی سے ایک آسائش کی کیفیت والا ہلکی حدت اور

سانسوں کا ایک موسم ٹھہرا ہوا تھا.. لیکن باہر ایک ایسی سرد یلی کاٹ تھی جس کے لیے وہ تیار نہ تھی.... اس نے ایک مرتبہ پھر ٹیلی فون کی تار کو کھینچ کر اطمینان کیا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس راکنگ چیئر کو ٹٹولا جو صبح سویرے اخبار پڑھنے کے لیے مرزا صاحب کی مرغوب بیٹھک تھی..

برآمدے میں گھپ اندھیرا تھا.. تمام روشنیاں بجھ چکی تھیں.. درختوں اور جھاڑیوں میں سرِ شام جو کرسمس لائٹس ٹمٹماتی تھیں اور مہمانوں کی آنکھوں کو اپنی سجاوٹ سے خیرہ کرتی تھیں اب وہاں نہیں تھیں.. بجلی کی سجاوٹ اور نمائش کرنے والے انہیں اتار کر لے جا چکے تھے..

راکنگ چیئر پر بیٹھ کر' فون کو اپنی گود میں رکھ کر وہ نمبر کے بٹن دبانے لگی.. اور اسے وہ فون نمبر زبانی یاد تھا.. جس شخص نے پوری زندگی اس آس میں بسر کی ہو کہ بالآخر جب وہ فارغ ہو گا تو کوئی ایک نمبر ڈائل کرے گا تو وہ اس نمبر کو کیسے بھول سکتا ہے.. ابھی اس نے ایک نابینا کی طرح بریل کے ابھرے ہوئے لمس تلے آئے ہوئے... صرف تین ہندسے دبائے تھے کہ اس کے بہت قریب میں.. یکدم تاریک اور سکوت میں آتی ہوئی خاموشی میں ایک پھڑ پھڑاہٹ سی ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی.. ٹیلی فون اس کی گود سے پھسل کر فرش پر جا گرا اور لاؤنج کے اندر سے کسی مہمان کی نیند میں بجھی ہوئی آواز چونکی "کون ہے؟"

چونگا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور ٹیلی فون فرش پر گرنے کا احتجاج کرنے کے بعد اب کہیں گہرے سکوت میں گم ہو چکا تھا.. وہ ڈر گئی تھی... وہ ڈرنے والی عورت تھی.. اسے اندھیرے سے.. چھپکلیوں سے.. چمگادڑوں سے.. اور مرزا صاحب سے ڈر آتا تھا.. دم روکے ہوئے اس کی غلافی آنکھیں مزید پھیل گئیں... برآمدے میں دھرے تین بڑے گملوں میں سے ایک پر.. جن میں انہی دنوں ڈبل پٹونیا کے پودے لگائے گئے تھے ان میں سے ایک گملے کے کنارے ایک کبوتر براجمان تھا.. اور وہ بھی اُس کی یکدم موجودگی سے اتنا ہی خوفزدہ ہوا تھا جتنی کہ وہ... اور وہی یکدم پھڑ پھڑایا تھا۔

اس کے تنے ہوئے خوف کے مارے اعصاب سکون میں آ گئے..

یہ عجیب سی رسم جانے ان کے رواجوں میں کہاں سے در آئی تھی کہ دولہن چوکھٹ میں قدم رکھے تو تیل ڈالنے کے علاوہ کبوتر چھوڑنے از حد ضروری ہیں.. شادی بیاہ

کے موقعوں پر ویسے بھی تھوڑا سا احمق اور بے دلیل ہو جانا خوشی کی نشانی ٹھہرتا ہے اور انسان اس قسم کے مشوروں کو قبول کرتا چلا جاتا ہے.. اسے آج سویرے ہی یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آنٹی دولہن کی آمد پر ہر صورت تین عدد کبوتر اس کی جانب اچھالنے ہیں' عام سلیٹی رنگ کے روشن دانوں میں بیٹیں کرنے والے کبوتر نہیں' بلکہ چتکبرے اور چینی پنکھوں ایسی گھیرے دار دموں والے کبوتر... اگرچہ پہلے دو بیٹوں کی شادی پر اس قسم کی کوئی پابندی نہ تھی لیکن ہر زمانے میں شادی کی رسمیں کچھ اور سے اور ہوتی جاتی تھیں.. وہ لوگ جو اپنی کاروں پر "کرش انڈیا" کے سٹکر لگائے پھرتے تھے شادیوں پر تیل مہندی اور دیگر شگن کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور تازہ ترین ہندوستانی فلم میں دکھائے گئے شادی کے ملبوسات خصوصی طور پر تیار کرواتے تھے اور ان رواجوں کی ہو بہو نقل کرتے تھے جو ان فلموں میں کولہے چھٹکاتی اور ناف لرزاتی خواتین دولہا دلہن کے سامنے پرفارم کرتی تھیں.... شاید یہ رسم بھی ادھر سے ہی آئی تھی اور وہ بحث نہ کر سکی کہ اس کے جواب میں یہی جواز پیش کیا جانا تھا کہ آنٹی خوشی کا موقع ہے.. چنانچہ تین چتکبرے چینی پنکھوں ایسی دموں والے کبوتر بہت ضروری تھے..

وہ شادی کے دیگر انتظامات اپنی بڑی بہنوں کے سپرد کر کے ذاتی طور پر برڈ مارکیٹ گئی تھی اور بڑی افراتفری میں گئی تھی.. اور وہاں مسئلہ یہ آن پڑا کہ پوری مارکیٹ میں چتکبرے اور چینی پنکھوں ایسی دموں والے صرف دو کبوتر مل سکے اور اس نے یہ سوچ کر کہ کبوتر کی نسل سے کیا فرق پڑتا ہے مجبوراً ایک دیسی قسم کا وہی روشندانوں میں بسیرا کرنے والا سرمئی کبوتر خرید لیا تھا..

یہ وہی دیسی کبوتر تھا جو دلہن کے گھونگھٹ پر سے پرواز کر جانے کی بجائے سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر یہاں پٹونیا کے بڑے گملے پر آ بیٹھا تھا اور ابھی تک بیٹھا ہوا تھا اور اسی نے اپنی یکدم پھڑپھڑاہٹ سے اسے ڈرا دیا تھا.. اپنی اس بدتمیزی کی معذرت میں وہ اب ہولے ہولے غٹر غوں غٹر غوں کر کے شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا..

اس نے ایک طویل سانس اپنے تھکے ہوئے پھیپھڑوں میں اتارا اور پھر جھک کر ٹیلی فون اٹھا لیا.. راکنگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے بٹنوں کو اپنی پوروں سے آہستہ آہستہ چھوتے ہوئے وہی نمبر مکمل کیا..

آخری ہندسہ دباتے ہی دوسری جانب گھنٹی بجنے کی آواز آئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے ذرا سا جھلایا اور انتظار کرنے لگی..

کبوتر نے ایک آخری غٹر غوں کی اور صورت حال سے مفاہمت کر لی..

خاور کے بوٹوں پر قبرستان کی دھول کی باریک تہہ تھی..

اپنے تھکے ہوئے دکھتے پاؤں کو ان میں سے نکالتے ہوئے اس نے دھول پر انگلی پھیری..ان ذرّوں میں..اس نے ہتھیلی پلٹ کر دھول سے اٹی پوروں کو دیکھا..ان ذروں میں جانے کیا صورتیں تھیں جو پنہاں تھیں..ہر ذرے میں کوئی نہ کوئی صورت تھی..

اس کا کھانا ٹیبل پر لگا تھا اور بشیر اپنا یہ فرض پورا کر کے اپنے کوارٹر میں..اپنی نو بیاہتا دوسری بیوی کے پاس جا چکا تھا اپنا وہ فرض پورا کرنے..

ٹیلی ویژن ابھی تک..رات کے اس پہر بھی آن تھا اور اس پر کوئی مینک والا شخص موجودہ حکمرانوں کو پیغمبری کی قربت میں لے جا رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک مکار اور پر تکبر تقدس تھا..

طاہرہ کی موت سر شام ہوئی تھی اور اصولاً اسے کل صبح کسی وقت دفنانا چاہئے تھا لیکن میت انتظار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی..اسی لیے اسے فوری طور پر رات میں ہی دفن کر دیا گیا..وہ ابھی طاہرہ کو ہی مٹی میں دبا کر آ رہا تھا..بلکہ اسے کدالوں کی مدد سے دفن کرنے والے تو پیشہ ور گورکن تھے اور وہ صرف ایک جانب کھڑا..جب کہ بہتر تصویر کی آرزو کرنے والے بے شمار اہم لوگ اسے دھکیل کر قبر کے کناروں پر جا تعینات ہوئے تھے وہ ایک جانب کھڑا..دیکھتا رہا تھا کہ ایک پر بہار اور کومل بدن کو کیسے مٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے..اور کیسے گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں لوگ اکتاہٹ سے پہلو بدلتے ہیں اور قبر کے مکمل ہونے کا انتظار کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے حصے کی مٹھی بھر مٹی ڈھیر پر پھینک کر فارغ ہوں اور گھروں کو لوٹیں..

ایک دھان پان سی گوری چٹی اور باریک ہنستی ہوئی آنکھوں والی لڑکی..طاہرہ..ایک پر اثر اور اپنی موجودگی سکرین پر ثابت کر دینے والی اداکارہ...اس میں تھوڑا سا فلمی رنگ تھا جو ٹیلی ویژن پر جچتا نہیں لیکن اس کے باوجود اس کی ظاہری معصومیت دل کو بھلی

لگتی تھی.. اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا بے اختیار اور بے مثل رونا دھونا تھا.. وہ ایسے مناظر میں تو روتی ہی تھی لیکن خوشی کے موقعوں پر بھی دھواں دار روتی ہوئی ہنستی تھی اور مسرت کو المیے کی قربت میں لے جا کر ایک نیا انداز دیتی تھی.. اور وہ روتی ہوئی اچھی لگتی تھی۔

اگر ٹیلی ویژن کے لیے کوئی کھیل لکھتے ہوئے اسے پروڈیوسر یہ اطلاع دے دیتا تھا کہ فلاں کردار کے لیے میں نے طاہرہ کو منتخب کیا ہے تو وہ اس کی آسائش کے لیے خاص طور پر ایسے منظر تحریر کرتا تھا جن میں وہ دل کھول کر آسانی سے آنسو بہا سکتی تھی..

وہ ہمیشہ اسے "منی مدھوبالا" کہتا اور وہ منہ بنا کر ذرا نخریلی ہو کر روٹھنے کے انداز میں کہتی "خاور صاحب... آپ مجھے منی کیوں کہتے ہیں.. کیا صرف مدھوبالا کافی نہیں ہے؟"

"بھئی اس لیے کہ مدھوبالا تو پٹھانی تھی.. ہڈ پیر کی مضبوط اور ذرا فراخ.. اور تم ذرا دھان پان اور مختصر ہو.. اس کا منی ایڈیشن.. نو آفنس.."

آخری بار وہ اسے تب ملی تھی جب وہ ٹیلی ویژن سٹیشن کے صدر دروازے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا اور وہ کسی ڈرامے میں شوٹنگ کے وقفے کے دوران باہر آ کر اس کے برابر میں آ بیٹھی تھی.... وہ ٹھیک نہیں لگتی تھی.. اسے دیکھ کر خاور کو کچھ ملال سا ہوا.. میک اپ کے باوجود اس کے چہرے پر رونق نہیں تھی اور وہ پھولا ہوا سا لگتا تھا.. وہ پہلے سے بھی دبلی ہو چکی تھی..

"خاور جی.. آپ نے آج تک جتنی لڑکیاں دیکھی ہیں.. کیا میں ان سب سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوں.." اس نے بڑی سنجیدگی سے یہ سوال پوچھا تھا۔

دسمبر کی دھوپ میں اس کے چہرے کی زردی میک اپ کی تہوں میں سے پھوٹتی تھی اور وہ ہر بار جب سانس لیتی تھی تو اسے کھینچ کر لیتی تھی..

"صرف ایک کے سوا... تم سب سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش لڑکی ہو" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا..

"اور وہ ایک کون ہے؟" اس نے باقاعدہ برا منا لیا "کون ہے؟"

"میں ابھی اس سے نہیں ملا.." اس نے پھر ہنس کر کہا..

"میں جیت گئی.. میں جیت گئی.." اس نے خاور کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے کر دسمبر

کی دھوپ میں بلند کر دیا اور بچوں کی طرح نعرے لگانے لگی۔

پھر اخباروں میں اس کی بیماری کی خبریں تواتر سے آنے لگیں..

کامپلیکس کے ہسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں..ایک عام سے کمرے میں جس میں فینائل کی تیز بُو تھی اور جس کی کھڑکی کے باہر کوڑے کے ڈرم تھے جن میں غلیظ پٹیاں اور مریضوں کے اندر سے برآمد ہونے والی رسولیاں اور آپریشن کے ذریعے بدن سے الگ کر دیئے جانے والے بدن کے کچھ حصے تھے اور ان پر ہمہ وقت دو تین موٹی موٹی بلیاں اپنی شکم پری کے بعد پنجوں سے مونچھیں سنوارتی تھیں اور کبھی کبھار کھڑکی کے اندر اس بستر کی جانب آنکھیں کرتی تھیں جس پر طاہرہ لیٹی تھی..اگرچہ اس کا چہرہ بے روح ہو جانے کے باوجود وہی تھا لیکن اس کا بدن نہ تھا..اس کا پیٹ بے طرح پھولا ہوا تھا اور اس پر چادر کھسکتی تھی اور وہ اپنے پاؤں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی..اس کی آنکھوں اور پاؤں کے درمیان ایک گنبد ابھرا ہوا تھا جو کبھی اس کا ستواں پیٹ ہوا کرتا تھا..اور اس کی آنکھیں بار بار ناتوانی سے بند ہوتی تھیں...بستر کی پائنتی کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک مستطیل میز تھی جس پر پھولوں کے درجنوں گلدستے دھرے تھے لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی کہ اس کا پھولا ہوا پیٹ حائل ہوتا تھا..

سرہانے کے ساتھ ایک تپائی پر اپنے عہد کی ایک پرکشش اور مخبوط الحواس اور اپنے آپ میں کھو کر اداکاری کرنے والی ٹیلی ویژن کی اداکارہ... سکینہ بانو اس کا ہاتھ تھامے ہوئے نہایت رنجیدہ اور مغموم حالت میں از حد پریشان کہہ رہی تھی "طاہرہ..تم اچھی ہو جاؤ گی..میں نے ابھی ڈاکٹروں سے بات کی ہے..وہ کہتے ہیں کینسر لاعلاج مرض نہیں رہا..وہ تمہاری اداکاری کے شیدائی ہیں، تمہیں مرنے نہیں دیں گے..تم اچھی ہو جاؤ گی اور پھر..ہم دونوں ایک زبردست ڈرامے میں کام کریں گی.."

کمرے کا دروازہ کھلا...

برآمدے میں بیٹھا بوڑھا وارڈ بوائے طاہرہ بی بی کے کمرے میں ہر کسی کو آنے نہیں دیتا تھا..

اس لیے جو بھی آتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا جسے دیکھ کر وارڈ بوائے پہچان جاتا تھا اور متاثر ہو جاتا تھا اور کھڑے ہو کر دروازہ کھولتا تھا..

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ہی بہت ہی فکر مند اور گھبرائی ہوئی اور بیٹھی ہوئی آواز والی قدرے عمر رسیدہ اداکارہ نجمہ گیلانی داخل ہوئی اور روتی ہوئی طاہرہ کا دوسرا ہاتھ تھام کر ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "جان تم فکر نہ کرو.. میں نے ابھی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے بات کی ہے.. تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے جان.. حوصلہ کرو.. تم تندرست ہو جاؤ گی اور پھر ہم دونوں.." اس کی نگاہ کھڑکی کے قریب کرسی پر سر جھکائے خاور تک گئی "اور پھر ہم دونوں خاور صاحب کے لکھے ہوئے ڈرامے میں کام کریں گی.. تم اچھی ہو جاؤ گی.."

طاہرہ کا دوسرا ہاتھ تھامے ہوئے سکینہ بانو نے یہ سنا تو اس کا پارہ یکدم چڑھ گیا "تم کس کھاتے میں ہو.... پروڈیوسروں کی چاپلوسیاں کر کے اور ان کے ہاتھ چوم چوم کر تو تم کاسٹ ہوتی ہو... میں تمہیں نہیں جانتی.. طاہرہ کے ساتھ میں کام کروں گی.."

نجمہ گیلانی ٹھنڈے مزاج کی اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والی عورت تھی اس نے آواز بلند نہیں کی.. طاہرہ کا ہاتھ تھامے رکھا اور کہا "بانو میرا منہ نہ کھلواؤ.. تمہارے فلیٹ میں جو آمد و رفت ہوتی ہے اس سے میں بخوبی واقف ہوں.. تم اتنی بھی مخبوط الحواس نہیں ہو جتنی بنتی ہو.."

بانو طاہرہ کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی "تمہارے پاس کچھ ہو تو تمہارے فلیٹ میں بھی آمد و رفت ہو.. طاہرہ کے ساتھ صرف میں کام کروں گی.. کیوں طاہرہ؟"

طاہرہ کسی اور کرّے کسی اور سیارے میں تھی.. اس کی آنکھیں بار بار بند ہوتی تھیں اور جب کھلتی تھیں تو اس کے سامنے اس کا پھولا ہوا پیٹ آتا تھا جس کے پار اس کے پاؤں تھے اور مستطیل میز پر سجے گلدستے تھے جن کے پھول اسے نظر نہ آتے تھے..

کھڑکی کے باہر کوڑے کے ڈرم پر بیٹھی ہوئی بلیاں کسی مریض کے پیٹ میں سے برآمد کردہ ایک لمبی آنت کو نہایت رغبت سے کھا رہی تھیں.. انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ وہ مریض جانبر ہوا ہے یا نہیں.. نجمہ نے طاہرہ کے رخساروں پر ایک تھپکی دی.. اس کے رخسار حنوط شدہ لگتے تھے "کیوں جان.. تم میرے ساتھ کام کرو گی ناں..."

اس کے بعد ایک عجیب تماشہ شروع ہو گیا.. بانو اور نجمہ باقاعدہ دست و گریباں ہونے کو آئیں اور خاور کو مجبوراً ان کے درمیان آنا پڑا... انہیں الگ کرنا پڑا..

اسے یاد تھا کہ اس لمحے طاہرہ کے باریک اور زرد ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ

آئی..اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا..

کمرے سے باہر جاتے ہوئے بانو اور نجمہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ آگیا اور انہوں نے باہر کھڑے گدھ اخبار نویسوں کے سامنے آبدیدہ ہو کر کہا...یہ ایک ذاتی المیہ ہے..لیکن آپ لوگ اگر رپورٹ کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں..کہ ہم طاہرہ کی بیمار پرسی کرنے کے لیے آئی تھیں..اور ہمیں بہت دکھ ہے..بہت ہی رنج ہے کہ وہ مر رہی ہے..ہم تصویر نہیں اتروائیں گی.."

طاہرہ اگلے روز مر گئی..

آج اس کے جنازے پر ایک عجیب انکشاف ہوا..پچھلے وقتوں کی جو تصویریں ان دنوں اخباروں کے خصوصی ایڈیشن میں شائع ہوتی تھیں کہ فلاں صاحب..اور فلاں سیاسی شخصیت..اور فلاں تحریک کے نامور کارکن...فلاں کی تدفین کے موقع پر سوگوار کھڑے ہیں تو ان تصویروں کا ماخذ کیا ہوتا تھا..

طاہرہ کے جنازے پر بیشتر جانے پہچانے لوگ جو چارپائی کو کندھا دیتے تھے آنکھیں کھلی رکھتے تھے اور دھیان میں رہتے تھے کہ پریس فوٹوگرافر کس جانب کیمرے سیدھے کرتے ہیں اور پھر اس جانب ایک سوگوار شکل کے ساتھ کندھا دیتے تھے۔

جب اسے گئی رات دفن کیا جا رہا تھا تو تمام اہم لوگ..اداکار..ادیب..سیاستدان اور دیگر معززین...قبر کے اس کنارے پر کھڑے تھے جس کے مقابل میں پریس فوٹوگرافر اپنے کیمرے درست کرتے تھے اور جب طاہرہ کی چارپائی کو اس کے جسد سے جدا کر کے اسے قبر کے ڈھیر پر رکھا گیا اور اس کی لاش کو نیچے اتارا جانے لگا تو کیمرہ مین ایک بہتر زاویے کے لیے یکدم اس کنارے سے دوسری جانب چلے گئے تو سوگواروں میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی اور وہ فوراً ادھر جا کھڑے ہوئے جہاں سے تصویر اتر سکتی تھی۔

خاور کے بوٹوں پر قبرستان کی دھول کی باریک تہہ تھی..

وہ اپنے تھکے ہوئے پاؤں بوٹوں میں سے نکال رہا تھا..

اپنی پوروں پر جمے ذروں میں پنہاں ہو گئی صورتوں کو دیکھ رہا تھا..اور ان بلیوں کی یادداشت اس کے ذہن سے غراتی دانت کچکچاتی محو نہ ہوتی تھی جو طاہرہ کے کمرے کی کھڑکی سے باہر کوڑے کے ڈرم پر بیٹھی شاید ایک آنت کو اور شاید ایک منقطع زندگی کے لوتھڑے کو

آپس میں جھنجوڑ رہی تھیں جب گھر کے سناٹے میں یکدم ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی....
چونگا اٹھانے سے پیشتر اس نے جلدی سے اپنی دھول بھری پوروں کو صوفے کے کپڑے پر رگڑ کر صاف کیا اور پھر نہایت بے دلی سے اسے اٹھایا اور صرف "جی.." کہا..
"خاور؟"
"جی میں بول رہا ہوں.."
جواب میں کچھ نہ آیا.. لیکن جو کوئی بھی تھا اس کا منہ رسیور کے بہت قریب تھا.. ایک مدھم سانس کی موجودگی سنائی دیتی تھی اور اس کے پس منظر میں ایک پھڑ پھڑاہٹ..
"کون ہے؟"
اسے واضح طور پر پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ ایک غٹرغوں قسم کی آواز بھی اگرچہ بہت مدھم مگر سنائی دی..
"کون ہے؟" اس نے پھر پوچھا اور چونگا کریڈل پر رکھنے کو تھا کہ ادھر سے ایک اور تھکاوٹ بھری آواز آئی "تم کیسے ہو؟" جیسے صدیوں سے جان پہچان ہو ایسے کہ تم کیسے ہو...
"میں ٹھیک ہوں جی.. لیکن آپ کون بول رہی ہیں؟"
"مجھے آپ نہ کہو.. تم کہو.."
"لیکن آپ کون بول رہی ہیں؟"
"پاگل خانہ..." آواز میں خوشی اور یقیناً ایک کبوتر کی غٹرغوں تھی۔
"اگر آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ آپ کون ہیں... اپنا تعارف نہیں کروائیں گی تو میں فون بند کر دوں گا.."
"تو میں دوبارہ کر لوں گی.. ابھی اور اسی وقت... سہ بارہ کر لوں گی... سو بار کر لوں گی یہاں تک کہ تم فون بند کرتے کرتے تنگ آ جاؤ.. اس لیے فون بند نہ کرنا.. تم کیسے ہو؟"
"میں.. بہت تھکا ہوا ہوں.. آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں.. میں فون کو ڈس کونیکٹ بھی کر سکتا ہوں.."
اسے اس نوعیت کے فون آتے رہتے تھے..
میڈیا کا طلسم ایسا تھا جو راکھ کو بھی الاؤ کی شکل دے کر لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ اس فریب کا شکار ہو کر اسی قسم کے فون کرتے تھے..